خدمتِ دین کو اِک فضلِ الٰہی جانو

بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ اپنی تصنیف ''تجلیاتِ الٰہیہ'' میں فرماتے ہیں: ''خدا تعالیٰ نے مجھے بار بار خبر دی ہے کہ وہ مجھے بہت عظمت دے گا اور میری محبت دلوں میں بٹھائے گا اور میرے سلسلہ کو تمام زمین میں پھیلائے گا اور سب فرقوں پر میرے فرقہ کو غالب کرے گا اور میرے فرقہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور نشانوں کے رُو سے سب کا منہ بند کر دیں گے اور ہر ایک قوم اس چشمہ سے پانی پئے گی اور یہ سلسلہ زور سے بڑھے گا اور پُھولے گا یہاں تک کہ زمین پر محیط ہو جاوے گا۔ بہت سی روکیں پیدا ہوں گی اور ابتلا آئیں گے مگر خدا سب کو درمیان سے اٹھا دے گا اور اپنے وعدہ کو پورا کرے گا۔ خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔''

اس عظیم الشان خوشخبری کو پورا ہوتا دیکھنے کے لیے آپ نے ۱۵ ستمبر ۱۸۹۷ء کو ایک اشتہار کے ذریعہ اعلان فرمایا: ''میں مناسب دیکھتا ہوں کہ بالفعل قادیان میں ایک مڈل سکول قائم کیا جائے اور علاوہ تعلیم انگریزی کے ایک حصہ تعلیم کا وہ کتابیں رکھی جائیں کہ جو میری طرف سے اس غرض سے تالیف ہوں گی کہ مخالفوں کے تمام اعتراضات کا جواب دے کر بچوں کو (دین حق) کی خوبیاں سکھائی جائیں اور مخالفوں کے عقیدوں کا بے اصل اور باطل ہونا سمجھایا جائے۔ اس طریق سے...... ذُریّت نہ صرف مخالفوں کے حملوں سے محفوظ رہے گی بلکہ بہت جلد وہ وقت آئے گا کہ حق کے طالب سچ کی روشنی (دین حق) میں پا کر باپوں اور بیٹوں اور بھائیوں کو (دین حق) کے لیے چھوڑ دیں گے۔''

تاریخِ احمدیت کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حضور کی اس تحریک کو عملی جامہ پہنچانے، مدرسہ کے انتظامی امور طے کرنے اور قواعد وضوابط کی تشکیل کے لیے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کے صدر حضرت حکیم مولوی نورالدین تھے۔ اس کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں مدرسہ کا افتتاح ۳ جنوری ۱۸۹۸ء کو ہوا تاہم کسی موزوں عمارت کی عدم موجودگی میں اس کا آغاز مہمان خانہ میں کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب حضرت نواب محمد علی مالیر کوٹلہ سے ہجرت کر کے قادیان آ گئے تو حضرت مسیح موعود نے مدرسہ کا جملہ انتظام ان کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے یہ قومی خدمت نہایت ذوق وشوق سے انجام دی چنانچہ یہ مدرسہ جس کا آغاز پرائمری سے ہوا تھا اسی سال مڈل، ۱۹۰۰ء میں ہائی سکول اور اس کے تین سال بعد کالج تک پہنچ گیا۔

گیارہ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو حضرت مولوی عبدالکریم سیالکوٹی اور ان کے دو ماہ بعد یعنی ۳ دسمبر ۱۹۰۵ء کو

حضرت مولوی برہان الدّین جہلمی کی وفات ہوگئی۔ ہر دو رفقاء حضرت مسیح موعود کے نزدیک خاص مقام رکھتے تھے چنانچہ آپ نے حضرت مولوی عبدالکریم کی وفات پر فرمایا کہ: ''وہ سلسلہ کی محبت میں بالکل محو تھے......ان کو ہمارے ساتھ ایک پورا اتحاد اور پوری موافقت حاصل تھی......ان کا خاتمہ قابلِ رشک ہوا کیوں کہ ان کے ساتھ دنیا کی ملونی نہ تھی۔'' اسی طرح حضرت مولوی برہان الدّین جہلمی کے متعلق فرمایا: ''ان کی طبیعت میں حق کے لیے ایک سوزش اور جلن تھی۔ مجھ سے قرآن شریف پڑھا۔ بائیس برس سے میرے پاس آتے جاتے تھے......میرے ساتھ بڑی محبت رکھتے تھے۔''

ان دونوں بزرگوں کی وفات سے جماعت میں جو زبردست خلا پیدا ہوا اس سے حضرت اقدس کو بہت تشویش ہوئی اور حضور کا ذہن خدائی تصرف کے تحت اس طرف منتقل ہوا کہ جماعت میں قادرالکلام اور دین کی خدمت کرنے والے علماء پیدا کرنے کا کوئی مستقل انتظام ہونا چاہئے چنانچہ حضور نے اپنے رفقا سے مشورہ کے بعد اس مدرسہ کے اندر دینیات کی ایک شاخ کھولنے کا فیصلہ کیا۔ شاخِ دینیات جنوری ۱۹۰۶ء میں کھل گئی اور اسی شاخ کے قیام سے مدرسہ احمدیہ کی بنیاد پڑی۔

۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو حضرت مسیح موعود رحلت فرما گئے اور اس سے اگلے ہی روز حضرت حکیم مولوی نورالدین قدرتِ ثانیہ کے پہلے مظہر کے طور پر منتخب ہوئے۔ آپ نے اپنی خلافت کے ابتدائی ایام میں ہی اپنے اس عزم کا اظہار فرمایا کہ چونکہ حضرت مسیح موعود کی شدید خواہش ایک دینی مدرسہ کے قیام کی تھی لہٰذا مدرسہ تعلیم الاسلام کے علاوہ الگ انتظام کے تحت ایک مدرسہ دینی علوم کے لیے قائم کیا جائے۔ اگرچہ بعض احباب کی طرف سے اس تجویز کی مخالفت ہوئی مگر بالآخر یکم مارچ ۱۹۰۹ء کو یہ مدرسہ قائم ہوا اور حضرت مولوی شیر علی کی تجویز پر اس کا نام ''مدرسہ احمدیہ'' قرار پایا۔ اس کے اوّلین ہیڈ ماسٹر حضرت سید محمد سرور شاہ مقرر ہوئے۔

اس مدرسہ کو کئی طرح کے انتظامی مسائل درپیش تھے چنانچہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد کل وقتی ''افسرِ مدرسہ احمدیہ'' مقرر ہوئے۔ آپ نے ستمبر ۱۹۱۰ء سے مارچ ۱۹۱۴ء تک یہ ذمہ داری نبھائی۔ دوست محمد شاہد مؤلف ''تاریخِ احمدیت'' کے الفاظ میں ''آپ کا دور مدرسہ احمدیہ کی تاریخ میں ایک سنہری دور کہلانے کا مستحق ہے۔ آپ سے قبل مدرسہ ناقص حالت میں تھا مگر آپ کے آتے ہی اس کی قسمت جاگ اٹھی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی کایا پلٹ گئی۔'' مارچ ۱۹۱۴ء میں جب آپ مسندِ خلافت پر متمکّن ہوئے تو مدرسہ کا انتظام حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد نے سنبھال لیا اور ۱۹۱۹ء تک اسے بخوبی سرانجام دیتے رہے۔

۲۰ مئی ۱۹۲۸ء کو ''جامعہ احمدیہ'' کے نام سے ایک الگ ادارہ قائم کا گیا۔ صدر انجمن احمدیہ کے وضع کردہ قواعد کے مطابق جامعہ میں داخلہ کے لیے مولوی فاضل پاس ہونے کی شرط لگا دی گئی جو مدرسہ احمدیہ کے طلبہ کے لیے گویا آخری امتحان تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے جامعہ احمدیہ کے افتتاح کے موقع پر فرمایا: ''جامعہ کے طلبہ کو ایک ہی مقصد اپنی زندگی کا قرار دینا چاہئے اور وہ (پیغامِ حق) ہے۔ خواہ عمل کے کسی میدان میں جائیں، کوئی کام کریں، اپنے حلقہ میں (پیغامِ حق) کو نہ بھولیں۔''

۱۹۴۷ء کی موسمی تعطیلات تک جامعہ احمدیہ اور مدرسہ احمدیہ قادیان میں بخیر وخوبی جاری رہے مگر تعطیلات کے بعد بیشتر طلبہ فسادات کی وجہ سے گھروں سے واپس نہ آ سکے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی قادیان سے لاہور ہجرت کے بعد ۱۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو قادیان میں باقی رہ جانے والے جامعہ احمدیہ اور مدرسہ احمدیہ کے اساتذہ وطلبہ لاہور آ گئے اور اسی مہینے کی ۱۳ تاریخ کو یہ دونوں ادارے وہاں جاری کر دیئے گئے۔ لاہور میں جگہ کی تنگی کے باعث جلد ہی یہ ادارے چنیوٹ منتقل ہو گئے مگر وہاں بھی ان کے لیے مناسب عمارت میسر نہ آ سکی چنانچہ دو ماہ بعد مولانا ابوالعطا جالندھری کی پرنسپل شپ میں دونوں اداروں کو مدغم کرنے کے بعد احمد نگر منتقل کر دیا گیا۔

جیسا کہ اس کتاب میں ذکر آ چکا ہے قیامِ پاکستان کے وقت میری عمر قریباً ڈھائی سال تھی اس لیے میں ذاتی طور پر ان میں سے کسی واقعہ کا بھی شاہد نہیں تاہم جامعہ احمدیہ کے اُس زمانے کے بہت سے طالب علم میرے حلقہ احباب میں شامل ہیں۔ ان میں محمد اجمل شاہد، حکیم نذیر احمد ریحان، عبدالباسط شاہد، عبدالسلام ظافر، منیرالدین احمد (جو یحییٰ فضلی کے قلمی نام سے جماعتی اور قومی اخبارات و جرائد میں لکھتے رہے ہیں)، میر غلام احمد نسیم، جمیل الرحمٰن رفیق، لئیق احمد طاہر، عزیز الرحمٰن خالد، ڈاکٹر محمد جلال شمس، منصور احمد عمر اور کمال یوسف شامل ہیں۔ میں نے غلام احمد نسیم اور منیرالدین احمد کے علاوہ کہ ان کی بعض تصنیفات میں جامعہ کے کچھ حالات پہلے سے چھپے ہوئے موجود ہیں باقی تمام دوستوں سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنے زمانہ کے جامعہ کے حالات سنائیں۔ ان میں سے اکثر نے زبانی مجھے بعض دلچسپ واقعات سنائے اور چند دوستوں نے اس دور کے کچھ حالات لکھ کر بھجوائے ہیں۔

یہ درست ہے کہ میں کبھی جامعہ احمدیہ کا طالب علم نہیں رہا لیکن ربوہ کا مستقل باسی ہونے کے ناطے میں اس کے بہت سے اساتذہ علی الخصوص سید میر داؤد احمد، سید میر محمود احمد ناصر، صاحبزادہ مرزا رفیع احمد، ابوالعطا جالندھری، قاضی محمد نذیر لائلپوری، صاحبزادہ ابوالحسن قدسی، خان ارجمند خان، مولوی ظہور حسین مجاہد بخارا، ماسٹر غلام حیدر، مولوی عطاء الرحمٰن طالب، ملک سیف الرحمٰن، ڈاکٹر نذیر احمد ریاض، مولوی ابوالمنیر نورالحق، مولانا محمد احمد جلیل، خورشید احمد شاد، پیر معین الدین، نورالحق تنویر، مولانا محمد احمد ثاقب، شیخ نور احمد منیر، ملک مبارک احمد، چوہدری محمد شریف، عبداللطیف بہاولپوری، عبدالرزاق پی ٹی آئی اور بعض دیگر دوستوں سے متعارف تھا۔ اگر چہ میں ان میں سے کسی کے ساتھ دوستی کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن ابا جی کے ساتھ ان کے تعلقات کی وجہ سے میں ان کے متعلق کچھ ایسی باتوں سے بھی واقف تھا جو شاید ان کے بعض قریبی دوست بھی نہ جانتے ہوں۔ اب ان میں سے اکثر بزرگان وفات پا چکے ہیں۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی مغفرت فرمائے اور اعلیٰ علیّین میں جگہ دے۔ جو باقی ہیں خدا تعالیٰ انہیں کام والی لمبی زندگی عنایت فرمائے۔

میں یہ ذکر کئے بِنا بھی نہیں رہ سکتا کہ میرے بہت سے عزیز جامعہ احمدیہ سے فارغ التحصیل تھے۔ دور کیا جانا ابا جی مدرسہ احمدیہ میں پڑھتے رہے تھے اور انہوں نے ۱۹۲۹ء میں یہیں سے مولوی فاضل کیا تھا۔ چچا ابراہیم کو ہنگری میں جماعت احمدیہ کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا۔ میرے بہنوئی، قریشی سعید احمد اظہر جامعہ احمدیہ سے

فارغ التحصیل تھے اور مجاہدِ سپین، کرم الٰہی ظفر میری تایا زاد ہمشیرہ کے شوہر تھے۔ان کے جامعہ احمدیہ میں گذرے ہوئے وقت اور عملی زندگی کے تجربات کے متعلق بات ہوتی تو اندازہ ہوتا کہ ایک مربی کو اپنا تربیتی عرصہ مکمل کرنے کے بعد میدانِ جہاد میں کس طرح کی زندگی گذارنا پڑتی ہے۔

یہاں یوں ہی ایک اور بات یاد آ گئی ہے۔ جن دنوں جامعہ احمدیہ (سینئیر) ربوہ کی موجودہ عمارت زیرِتعمیر تھی میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ ہم چھٹی کے وقت سکول سے نکلتے تو اس زیرِتعمیر عمارت کے پاس سے گذرتے ۔ گرمیوں میں ربوہ کی دھوپ ناقابلِ برداشت ہوتی چنانچہ ہم کئی بار ستانے کی خاطر اس عمارت میں بیٹھ جاتے ۔بعض دفعہ تو وہیں سکول کا کام شروع کر دیتے اور پھر آرام کے بعد اپنے گھروں کے لیے روانہ ہوتے۔

یہ ایک دلچسپ دور تھا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میری اس زمانے کی یادیں جامعہ کے ذکر سے خالی نہیں ہیں۔

اب میں اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے عرض کروں گا کہ اجمل شاہد جو حضرت منشی سربلند خان، رفیق حضرت مسیح موعود کے صاحبزادے اور سلسلہ کے پرانے خدّام میں سے ہیں قیامِ پاکستان کے وقت مدرسہ احمدیہ سے فراغت کے بعد جامعہ احمدیہ میں داخلے کی تیاری کر رہے تھے۔ یوں انہیں قادیان، لاہور، چنیوٹ اور پھر احمد نگر میں جامعہ احمدیہ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ وہ ۱۹۵۲ء میں یہاں سے فارغ ہوئے اور اس طرح انہیں جامعہ کا وہ دور اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا جو اَب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

جامعہ احمدیہ سے فراغت کے بعد انہوں نے ایک طویل عرصہ سابقہ مشرقی پاکستان، پشاور اور کراچی میں بطور مربی گذارا۔ ۱۹۷۲ء میں انہیں نائیجیریا بھجوایا گیا جہاں وہ سات سال تک مشنری انچارج اور امیر جماعت احمدیہ، نائیجیریا کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پچھلے کئی سال سے وہ امریکہ میں ہیں ۔موصوف جامعہ کے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتے ہیں کہ اب ربوہ جامعہ احمدیہ کے لیے دو نہایت وسیع وعریض عمارات تعمیر ہو چکی ہیں جن میں سے ایک جامعہ کی جونیئر کلاسز کے لیے مختص ہے تو دوسری سینئر کلاسز کے لیے۔ وہ تحدیثِ نعمت کے طور پر ذکر کرتے ہیں کہ اب تو دنیا کے مختلف ممالک میں اسی نام کے کئی ادارے قائم ہو چکے ہیں جہاں ان علاقوں کے طلبہ داخل ہو کر علومِ دین سیکھ رہے ہیں تاہم پاکستان میں اس کا آغاز انتہائی غریبانہ تھا اور اس کی حالت بالکل ایسی تھی جیسی وہاں کے دیہاتی سرکاری سکولوں کی ہوتی ہے بلکہ شاید اس سے بھی بدتر۔ تعلیم کے لیے ضروری لوازمات یعنی پڑھنے کے لیے کتب اور بیٹھنے کے لیے ضروری فرنیچر تک مفقود تھا اور کھانے کے لیے محض قُوتِ لایمُوت میسر تھی۔

وہ بتاتے ہیں: یہ حسنِ اتفاق ہے کہ اپنے ابتدائی دور میں جامعہ ربوہ کے دائیں بائیں دو مختلف مقامات پر رہا۔ ابتداءً لاہور میں شروع ہونے کے بعد جلد ہی چنیوٹ منتقل ہو گیا کیونکہ وہاں کچھ متروکہ جائیداد دستیاب تھی لیکن گڑھا محلّہ کی یہ عمارات بعض رہائشی مکانات پر مشتمل تھیں اور کسی تعلیمی ادارے کے لیے ہرگز موزوں نہ تھیں۔ بورڈنگ ہاؤس صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا جس میں طلبہ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں رہائش پذیر

تھے۔ کھانے پینے کی اشیاء کی قلت تھی۔ آپ یقین کریں کہ اس زمانے میں ہر طالب علم کو ایک وقت میں صرف ایک روٹی ملا کرتی تھی لیکن آٹے میں مٹی کی آمیزش کی وجہ سے اسے بھی چبانا مشکل ہو جاتا تھا۔ ہم اسے بالعموم نگلا کرتے تھے۔ ایک روٹی سے بھوک پوری طرح نہ مٹتی چنانچہ ہم مُولیاں اور گاجریں کھا کھا کر گذارا کیا کرتے تھے۔

چنیوٹ میں گذرے ہوئے دنوں کو یاد کرتے ہوئے وہ کہا کرتے ہیں: وہاں پر جامعہ کا آغاز ایک بہت ہی مختلف ماحول میں ہوا تھا۔ چنیوٹ کے لوگ اپنی زبان، کلچر اور رہن سہن میں قادیان کے کلچر سے بالکل مختلف تھے لہٰذا کئی دفعہ ہمارا جی چاہتا کہ ہم شہر اور ارد گرد کی دیہاتی زندگی دیکھیں چنانچہ ہم بعض اوقات شام کے وقت مختلف جہات میں نکل جاتے۔

ایک روز ہم نے دیکھا کہ ایک حویلی میں سے دھواں نکل رہا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہاں گڑ بن رہا ہوگا چنانچہ ہم اس طرف چل پڑے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک کا نام عبداللہ گجراتی تھا۔ اس نے ہمیں خبردار کیا کہ ایسی جگہوں پر عام طور پر کتے ضرور ہوتے ہیں لہٰذا اگر کوئی کتا حملہ آور ہو جائے تو اس سے ڈر کر بھاگنے کی بجائے اسی جگہ بیٹھ جانا چاہیئے، کتا حملہ نہیں کرے گا۔ یوں ہی باتیں کرتے کرتے جب ہم حویلی کے قریب پہنچے تو ایک کتا اچانک ہماری طرف لپکا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا نشانہ عبداللہ ہی بنا۔ اب عبداللہ نے دوڑ لگا دی اور کتا اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ ہم کھڑے چلاّ رہے تھے: ''عبداللہ بیٹھ جاؤ!'' ''عبداللہ بیٹھ جاؤ!'' لیکن وہ بجائے بیٹھنے کے بھاگتا ہی چلا جا رہا تھا اور کتا تھا کہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ہم نے پریشانی میں حویلی کے لوگوں کو مدد کے لیے پکارا چنانچہ ایک نوجوان نے کسی طرح اس کتے کو قابو کیا اور یوں عبداللہ کی جان چھوٹی۔ جب حالات معمول پر آئے تو ہم نے اس سے پوچھا کہ وہ کتے کے حملہ کے وقت بیٹھنے کی بجائے بھاگ کیوں کھڑا ہوا تھا تو اس نے برجستہ کہا: خدا کی قسم! بدحواسی میں مجھے یاد ہی نہیں آیا کہ ایسے موقع پر بیٹھ جانا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ یہ واقعہ کافی دن تک طلبہ کے درمیان ہنسی مذاق کا موضوع رہا۔

چند ماہ چنیوٹ میں گذارنے کے بعد جامعہ کو احمد نگر منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اجمل شاہد کہتے ہیں:
مجھے یاد ہے ایک روز ہمارے پرنسپل، ابوالعطا جالندھری نے صبح کی اسمبلی میں ہمیں یہ مژدہ سنایا کہ جامعہ کو چنیوٹ سے احمد نگر منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور اس مقصد کے لیے وہاں پر ضروری عمارات حاصل کر لی گئی ہیں۔ انہوں نے خوشخبری سنائی کہ وہاں پر طلبہ کو رہائش کی قدرے بہتر سہولتیں حاصل ہوں گی اور امید ظاہر کی کہ وہ احمد نگر کی کھلی آب و ہوا کو پسند کریں گے۔

موصوف اس سفر کی داستان سناتے ہوئے کہتے ہیں: اس وقت تک کم از کم میں نے احمد نگر نہیں دیکھا تھا لہٰذا میرے لیے یہ تصور کرنا آسان نہ تھا کہ وہاں منتقل ہونے میں طلبہ کے لیے کیا فوائد مضمر ہیں تاہم انتظامیہ کے حکم کے تحت جامعہ کے تمام طلبہ چنیوٹ سے پیدل احمد نگر کے لیے روانہ ہو گئے جو وہاں سے کم و بیش دس میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہ ایک طویل سفر تھا تاہم اس وقت جوانی کا عالم تھا لہٰذا ہم ہنستے کھیلتے، پیدل منزلِ مقصود پر پہنچ

گئے۔ رہا ہمارا سامان تو وہ حسبِ وعدہ کسی سواری کے ذریعہ الگ سے وہاں پہنچا۔

اس بات پر پینسٹھ سال گذر رہے ہیں اور اس عرصے میں علاقے کا نقشہ بدل چکا ہے تاہم اس زمانے میں اس راستے پر آبادی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ دریائے چناب کا دوسرا پل عبور کیا تو وہ صحرا شروع ہو گیا جہاں بعد میں مرکزِ احمدیت آباد ہوا۔ سڑک کے دونوں طرف اک وادئ غیر ذی زرع میں شورے کی چادر بچھی ہوئی تھی اور سبزہ نام کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ شومئ قسمت، راستے میں ہمیں سرخ آندھی نے آ لیا۔ یہ گرد وغبار کا ایک نہ تھمنے والا طوفان تھا جو نہ جانے کتنی دیر چلتا رہا۔ ہمارا منہ، سر اور آنکھیں مٹی سے بھر گئیں ور ایک ایسا وقت بھی آیا جب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہم نے ٹوپیاں پہن رکھی تھیں لیکن آندھی اتنی تیز تھی کہ باوجود کوشش کے بہت سے طلبہ کی ٹوپیاں اُڑ گئیں اور وہ ننگے سر احمد نگر پہنچے۔

ہم لوگ پیدل اتنے لمبے سفر کے عادی نہ تھے لہٰذا احمد نگر پہنچتے پہنچتے ہم تھک کر چُور ہو گئے۔ ہماری بھوک بھی جوبن پر تھی۔ انتظامیہ کو ہماری کیفیت کا اندازہ تھا چنانچہ اس شام کھانا وافر مقدار میں تیار کرایا گیا تھا اور اجازت دی گئی کہ ہر آدمی اپنی بھوک کے مطابق جتنا جی چاہے کھانا کھا سکتا ہے۔ عرصہ دراز کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔

اس سوال کے جواب میں کہ احمد نگر میں منتقلی سے طلبہ کو اپنے حالات میں کیا تبدیلی محسوس ہوئی اجمل شاہد بتاتے ہیں: اگرچہ احمد نگر میں رہائشی سہولتیں قدرے بہتر تھیں مگر کھانے پینے کی اشیاء کی قلت بدستور رہی۔ اُن دنوں دریائے چناب کے اردگرد جنگلی کبوتر کافی تعداد میں پائے جاتے تھے۔ بعض طلبہ نے اپنی بھوک مٹانے کے لیے انہیں شکار کرنا شروع کر دیا۔ یاد رہے کہ یہ کبوتر رات کے وقت دریائے چناب کے پُل میں پناہ لیتے تھے۔ جامعہ کے ایک طالب علم جو نظام الدین مہمان کہلاتے تھے اور جن کا تعلق کشمیر سے تھا کو اس پُلی پر چڑھنے کا فن خوب آتا تھا۔ وہ اپنی شلوار کے پائینچے کسی رسی سے باندھ کر اوپر چڑھ جاتے اور کبوتر پکڑ پکڑ کر اپنی شلوار میں ڈالتے جاتے۔ رات کے وقت جب کبوتر سوئے ہوتے نظام الدین ان پر اچانک حملہ کر کے انہیں بہ آسانی دبوچ لیتے اور شلوار کے اندر ڈال کر نیچے اتر آتے۔ پھر وہ کبوتروں کو ذبح کرتے۔ خود بھی کھاتے اور دوسروں کو بھی کھلاتے۔ ان کا مقولہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے اس بیابان میں ہمارے لیے یہ من وسلویٰ اتارا ہے لہٰذا ہمیں اس نعمت سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئے۔

ہوسٹل میں طلبہ کی شرارتیں جاری رہتیں۔ ایک دفعہ کوئی شخص شہد بیچنے کے لیے آیا تو ایک طالب علم نے خرید لیا۔ یہ بات کچھ طلبہ کے علم میں آ گئی اور وہ چوری چوری یہ شہد کھانے میں کامیاب ہو گئے لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ شرارت کے سرغنہ کو یہ چوری راس نہ آئی۔ شاید اس نے بہت زیادہ شہد کھا لیا تھا۔ اس پر اسہال کا اتنا شدید حملہ ہوا کہ اسے جان کے لالے پڑ گئے۔ جب اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو طلبہ نے اس کا خوب خوب مذاق اڑایا۔

اس زمانے میں بجلی کا تو کوئی تصور ہی نہ تھا چنانچہ موسم کی شدت کی وجہ سے کمروں میں بیٹھنا مشکل

ہوجاتا۔اس کا حل یہ نکالا گیا کہ سڑک کے کنارے درختوں کی چھاؤں میں کلاسز منعقد ہوں۔طلبہ کے بیٹھنے کے لیے ارضُ اللہ بہت وسیع تھی۔ان ہی مشکل حالات میں ہم نے مولوی فاضل کا امتحان دیا۔

مقامی لوگوں کے ساتھ جامعہ کے طلبہ کے روابط کا ذکر ہوتو اجمل شاہد برجستہ جواب دیتے ہیں: شروع میں مقامی لوگ جن کو ہم ''جانگلی'' کہتے تھے ہمیں قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔وہ ہمیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق تصور کرتے تھے جو نہ جانے کس مقصد سے ان کے گاؤں میں آبراجمان ہوئی تھی۔وہ ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا کرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ جب بعض طلبہ نے اپنی اپنی ''پسندیدہ ماسیوں'' سے دودھ، دہی، مکھن وغیرہ خریدنا شروع کردیا تو وہ لسّی مفت دے دیتیں۔اس طرح کے میل جول سے آہستہ آہستہ مقامی لوگوں اور مہاجرین میں دُوری ختم ہوتی گئی۔

ربوہ کے لیے حکومت سے زمین خریدنے کی بات ہوتو موصوف بتاتے ہیں: ابھی احمد نگر میں چند ہی ماہ گذرے تھے کہ جماعت کے مرکز کے لیے ربوہ والی زمین خرید لی گئی۔اس زمانہ میں یہ جگہ بالکل ناکارہ تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا تاحدِ نگاہ سفید نمک کی ایک دبیز چادر بچھی ہوئی ہے۔دور دور تک آبادی کا نام ونشان نہ تھا۔ایک دن ہم نے اس جگہ کا جائزہ لینے کا پروگرام بنایا چنانچہ ہم سڑک سے ریلوے لائن تک چل کر گئے۔ مجھے یاد ہے ہمارے پاؤں زمین میں دھنس رہے تھے چنانچہ ہم بمشکل ریلوے لائن تک پہنچے اور پھر اسی پر چلتے چلتے احمد نگر واپس آئے۔

اس سوال کے جواب میں کہ کیا حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی بھی کبھی جامعہ کے معائنہ کے لیے شریف لائے تھے تو اجمل شاہد ایک منٹ کے توقف کے بعد کہتے ہیں: ہاں!

ہمارے احمد نگر منتقل ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد حضرت مصلح موعود ایک بار تشریف لائے تھے۔حضور جامعہ میں بھی آئے اور طلبہ سے خطاب کیا جس میں آپ نے ہمیں بعد میں ربوہ آکر آباد ہونے والے احمدیوں کا ''ہراول دستہ'' قرار دیا۔آپ نے واقفِ زندگی طلبہ کو حضرت اسماعیل کی اس اولاد سے تشبیہہ دی جس نے مکہ شریف کی وادئ غیر ذی زرع کو آباد کیا تھا۔اس سے کچھ عرصہ پہلے احمد نگر میں احمدیہ بیت الذکر کا سنگِ بنیاد رکھا جا چکا تھا۔سنگِ بنیاد مولانا ابوالعطا جالندھری نے رکھا تھا تاہم حضور نے اس نامکمل بیت الذکر میں مغرب کی نماز پڑھا کر گویا اس کا افتتاح فرمادیا۔

اجمل شاہد کو یاد ہے کہ جامعہ کی احمد نگر سے ربوہ منتقلی کے بعد بھی ایک بار حضور جامعہ میں آئے تھے۔وہ بتاتے ہیں: ربوہ کی آبادی پہلے دفاتر کے عارضی خیموں کے ذریعہ شروع ہوئی۔۱۹۴۹ء میں وہاں پہلے جلسہ کے انعقاد کا فیصلہ ہوا تو اس کے لیے عارضی بیرکیں تعمیر ہوئیں۔جلسہ کے بعد ان ہی تعمیرات کو رہائشی مقاصد اور دفاتر کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔حضور ربوہ کی جلد آبادکاری کے پیشِ نظر وہاں تعلیمی اداروں کا فوری اجرا چاہتے تھے چنانچہ لنگرخانہ کے لیے تعمیر کی گئی ایک ایسی ہی عمارت میں جامعہ کو منتقل کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا اور جامعہ کی کلاسز اس لنگرخانہ کے ایک حصہ میں شروع ہوگئیں۔عمارت کا کچھ حصہ طلبہ کی رہائش کے لیے مختص کیا گیا۔ یہ

عمارت بارشوں کے موسم میں ٹپکتی تھی اور آندھی کی شدت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہ رکھتی تھی۔ اس زمانہ میں سرخ اور سیاہ اندھیریاں بکثرت آتی تھیں۔ یہ اپنے ساتھ ریت اور کلر اڑا کر کمروں میں مٹی کی ایک تہہ جما دیتی تھیں جو کئی دنوں کی جھاڑ پھونک سے صاف ہوتی۔ بجلی اور پانی کی مشکلات بھی تھیں۔ گرمیوں میں کلاسز کھلے برآمدوں میں منعقد ہوتی تھیں۔ اس دور میں بھی حضور ایک دفعہ جامعہ میں تشریف لائے اور طلبہ کی مشکلات کا جائزہ لیا۔

اجمل شاہد بتاتے ہیں: حضور جامعہ کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے بے حد فکرمند رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے دو مواقع پر آپ نے طلبہ کو قصرِ خلافت میں طلب فرمایا۔ پہلی ملاقات میں آپ نے طلبہ سے فرداً فرداً تعارف حاصل کیا اور بتایا کہ اب جامعہ کو جامعۃ المبشرین کا نام دیا گیا ہے اور بدلتے ہوئے زمانہ کے لحاظ سے کورس میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہے۔ اس زمانے میں چونکہ کمیونزم کا عروج تھا اس لیے کورس میں اس مضمون کا خاص طور پر اضافہ کیا گیا تا کہ جماعت کے علماء اسلامی نظامِ اقتصاد سے پوری طرح واقف ہوں۔ اسی طرح طبِ یونانی کا مضمون بھی غالباً پہلی بار رائج کیا گیا تھا۔ حضور چاہتے تھے کہ طلبہ اپنی عملی زندگی میں اس سے استفادہ کر سکیں۔ کمیونزم کا مضمون مولانا غلام باری سیف اور طب کا مضمون ڈاکٹر نذیر احمد ریاض پڑھاتے تھے۔

اُن دنوں جامعہ میں پڑھانے والے اساتذہ کا ذکر چھڑ جائے تو اجمل شاہد بعض دلچسپ واقعات سناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ہمارے اساتذہ میں سے ایک شیخ عبدالخالق تھے جو ہمیں عیسائیت پڑھاتے تھے۔ وہ اسلام قبول کرنے سے پہلے عیسائی پادری تھے اور انہیں بائبل پر عبور حاصل تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس دور میں شراب و کباب کے رسیا تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ام الخبائث سے تو توبہ کر لی لیکن متبادل کے طور پر افیون کا استعمال شروع کر دیا۔ اگر ان کو کسی وقت افیون کی پوری مقدار نہ ملتی تو نہ صرف ان کی چال ڈھال بلکہ ذہنی چستی بھی متاثر ہونے لگتی۔

ہم ارجمند خان سے بھی پڑھتے رہے ہیں۔ وہ روایتی افغان تھے۔ طبیعت میں سختی تھی لیکن طلبہ کے بہت ہمدرد تھے اور ان کے دکھ سکھ میں انہیں حوصلہ دیتے تھے۔ وہ انگریزی زبان سے بالکل نابلد تھے چنانچہ مشہور تھا کہ ایک بار انہوں نے ایک طالب علم سے پوچھا کہ تم کیوں فیل ہو گئے ہو؟ اس نے جواباً کہا: میں سب مضامین میں پاس ہوں لیکن بدقسمتی سے aggregate میں رہ گیا ہوں۔ اس پر خان صاحب نے بیساختہ کہا: او کمبخت تو نے اتنا مشکل مضمون لیا کیوں تھا؟ کمبخت کا لفظ خان صاحب کا تکیہ کلام تھا لیکن اس میں بھی ان کی محبت کا رنگ جھلکتا تھا۔

اجمل شاہد کے پاس وقت ہوگا تو وہ آپ کو یہ بھی ضرور بتائیں گے کہ اس دور کے اساتذہ میں سے ایک عطاالرحمٰن طالب بھی تھے جنہیں استاد ابن الاستاد کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ انہیں صرف ونحو پڑھاتے تھے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ اس زمانہ میں انہوں نے ایک نظم لکھی جس کا پہلا شعر تھا:

سنتے ہیں بلبل کو اس کا آشیاں مل جائے گا

قادیاں والوں کو ان کا قادیاں مل جائے گا

ایک طالب علم نے جو خود بھی شعر کہنے کی مشق کیا کرتا تھا ایک مجلس میں یہ کہہ دیا کہ اس نظم کا وزن درست نہیں۔ کسی نے یہ بات عطاالرحمٰن طالب کو پہنچا دی۔ چنانچہ انہوں نے پوری ایک گھنٹی اسی موضوع پر گفتگو میں گذار دی اور واضح کیا کہ اس نظم کا وزن ہر لحاظ سے صحیح اور فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات کے مطابق ہے۔ الغرض انہوں نے نہایت شدت سے اپنے شاگرد کے احمقانہ اور غیر ذمہ دارانہ رویّہ کا محاسبہ کیا۔ معترض نے یہ سارا لیکچر سر جھکا کر انتہائی شرمندگی کے عالم میں سُنا۔

کھیلوں کا ذکر آ جائے تو اجمل شاہد بتاتے ہیں: قادیان کے زمانہ میں جامعہ کی والی بال ٹیم کی بہت شہرت تھی چنانچہ جامعہ کے احمد نگر اور پھر ربوہ منتقل ہونے کے بعد اسی کھیل کی طرف توجہ دی گئی۔ شام کو طلبہ اس گیم میں شوق سے شریک ہوتے۔ خدام الاحمدیہ کے اجتماعات میں جامعہ کی ٹیم اکثر و بیشتر اوّل رہتی۔ سال میں ایک دو دفعہ جامعہ کے طلبہ کی مختلف ٹیمیں باہمی میچ کھیلتیں۔

طلبہ کی تفریحی سرگرمیوں کا ذکر آ جائے تو اجمل شاہد بتاتے ہیں: طلبہ کے پکنک منانے کی ربوہ میں ایک ہی جگہ تھی اور وہ تھی دریائے چناب کا کنارہ۔ گرمیوں میں عام طور پر ہر ماہ ایک پکنک دریا پر منائی جاتی تھی۔ وہاں ورزشی مقابلہ جات کے علاوہ نظموں اور لطائف کا ہلکا پھلکا پروگرام بھی ہوتا تھا بعض اوقات پکنک رات کے وقت دریا کے اندر کسی جزیرہ میں منائی جاتی۔ یہ تجربہ بھی بڑا دلچسپ ہوتا۔ رات کو بڑے کچھوے جن کو پریت کہا جاتا تھا کنارے پر آ جاتے۔ ان سے الٹ پلٹ کر کھیلنا طلبہ کا مرغوب مشغلہ تھا۔ بعد میں لوگوں نے انہیں پکڑ کر کھانا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں یہ جنس آہستہ آہستہ نایاب ہوگئی۔

جب اجمل شاہد سے پوچھا جائے کہ کیا جامعہ کے طلبہ رفاہی کاموں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے تو وہ کہتے ہیں: رفاہی اور جماعتی کاموں کے لیے جامعہ کے طلبہ ہر وقت دستیاب رہتے تھے۔ گرمیوں میں اکثر جب چناب کا سیلابی پانی ربوہ کے اردگرد کے دیہات کے لیے خطرہ بن جاتا تو مقامی لوگوں اور ان کے سامان کو محفوظ مقامات پر منتقل کرنے میں ربوہ کے دیگر خدام کے ساتھ جامعہ کے طلبہ بھی خدمت سرانجام دیتے۔ اسی طرح جب فرقان فورس کا قیام عمل میں آیا تو طلبہ نے اس میں بھرپور شرکت کی اور مجھے بھی اس خدمت کا اعزاز حاصل ہے۔

اس سے پہلے کہ میں فرقان فورس میں اجمل شاہد کی شمولیت اور ان کی زبانی اس زمانے کے کچھ حالات بیان کروں مناسب معلوم ہوتا ہے قارئین کی معلومات کے لیے یہ وضاحت کر دی جائے کہ فرقان فورس سے مراد ہے کیا؟ اس حوالے سے تاریخِ احمدیت جلد پنجم مؤلفہ دوست محمد شاہد کے یہ اقتباسات پڑھنے کے لائق ہیں جن کے مطابق: ''حکومتِ پاکستان کے بعض فوجی افسروں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی سے محاذِ جموں کے لیے ایک پلاٹون بھجوانے کی خواہش کی جس پر حضور نے صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب کی کمان میں چالیس پچاس احمدی جوان بھجوائے جو ڈپٹی کمشنر صاحب سیالکوٹ کے ایما پر جموں سرحد پر واقع گاؤں معراجکے میں متعین کئے گئے جہاں بھارتی فوج کی بمباری اور گولہ باری اکثر اوقات جاری رہتی تھی اور پے در پے ہوائی حملے ہوتے

رہتے تھے۔کمپنی کے بہادر سپاہی دن کو اپنے دفاعی مورچوں میں ڈٹے رہتے اور رات کو پٹرولنگ کے ذریعہ سے دشمن کی سرگرمیوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔اس محاذ پر دو احمدی نوجوانوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ یہ کمپنی ابھی معرا جکے ہی میں نبرد آزما تھی کہ حکومت پاکستان کی طرف سے ایک رضا کار بٹالین کے قیام کا منشا ظاہر ہوا جس پر سیّدنا المصلح الموعود نے جماعتِ احمدیہ میں شوقِ جہاد اور ذوق شہادت کی ایسی زبردست روح پھونک دی کہ احمدی جوان ملک کے چاروں طرف سے لبیک کہتے ہوئے رتن باغ، لاہور میں پہنچنے شروع ہو گئے اور جون ۱۹۴۸ء میں فرقان بٹالین معرض وجود میں آ گئی اور معرا جکے میں متعین سپاہی اس بٹالین میں منتقل کر کے سرائے عالمگیر کے قریب سوہن گاؤں سے متصل بھجوا دیئے گئے جہاں نہر کے کنارے بٹالین کا فوجی کیمپ قائم کیا گیا۔حضور نے اس بٹالین میں رضا کار بھجوانے اور دوسرے ضروری انتظامات کرنے کا کام ایک کمیٹی کے سپرد فرمایا جو مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھی: حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب......،مولوی عبدالرحیم صاحب درد......،سید زین العابدین ولی اللہ شاہ صاحب......،مولوی عبدالمغنی خاں صاحب......

فرقان بٹالین جون ۱۹۴۸ء سے جون ۱۹۵۰ء تک قائم رہی جس کی قیادت کے فرائض شروع میں (کرنل) سردار محمد حیات صاحب قیصرانی نے، بعدازاں کرنل صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب نے انجام دیئے۔فورس کی ٹریننگ اور اسلحہ بندی کے لیے صرف ایک ماہ کا عرصہ کافی سمجھا گیا۔ٹریننگ پروگرام تیار کئے گئے اور رضا کاروں کو جلدی جلدی......ہتھیاروں کے استعمال، میدانِ جنگ کی سوجھ بوجھ (فیلڈ کرافٹ)، پٹرولنگ وغیرہ کی ٹریننگ دے دی گئی۔ بریگیڈیئر کے ایم شیخ عموماً اس فورس کا معائنہ کرتے اور ہر بار اس کی ٹریننگ کی رفتار اور نوجوانوں کے شوق سے نہایت مطمئن ہو کر لوٹتے تھے۔۱۰ جولائی ۱۹۴۸ء کو بٹالین محاذِ جنگ باغ سر (برلط) کی طرف روانہ ہوئی۔ زبردست بارشوں کی وجہ سے راستے مسدود ہو کر بہہ گئے تھے۔ ان حالات میں آگے بڑھنا بلاوجہ خطرات مول لینے کے مترادف تھا اس لیے بٹالین نے رات کو سیکٹر ہیڈ کوارٹر پر قیام کیا...... آدھی رات کے بعد فضا توپ کے گولوں سے گونج اٹھی۔ اگلے روز اس امر کا انکشاف ہوا کہ ہندوستانیوں کو بٹالین کے آگے بڑھنے کی کسی طرح اطلاع مل گئی تھی اور یہ گولہ باری ان ہی کے آگے بڑھنے والے راستوں پر کی گئی تھی۔اس واقعہ سے ہر کمانڈر کو یقین ہو گیا کہ خبروں کے نکل جانے کے سلسلہ میں کڑے انتظامات کرنے چاہئیں تا ہندوستانیوں کو ہماری خبریں نہ مل سکیں۔ اگلی رات فرقان بٹالین نے اپنے مورچے سنبھال لئے اور بٹالین پانچ کمپنیوں میں تقسیم کر دی گئی (۱) نصرت کمپنی (۲) برکت کمپنی (۳) تنویر کمپنی (۴) شوکت کمپنی (۵) عظمت کمپنی......صورت حال یہ تھی کہ ہندوستانی غیر مملوکہ علاقہ (نومَین لینڈ) پر پورا تسلط جما چکے تھے اور ان کے شبانہ پٹرول فرقان بٹالین کے اگلے مورچوں تک بلا روک ٹوک پہنچتے تھے اور ان کے جاسوس ان مورچوں کے عقبی دیہات میں کثرت سے پھیلے ہوئے تھے اور مقامی باشندں سے اہم خبریں ہندوستانیوں کو پہنچایا کرتے تھے۔فرقان بٹالین کے اپنی پوزیشن لے لینے پر ہندوستانی سپاہیوں نے مسلسل ہوائی اور بری حملے کئے تا نئی بٹالین کو پسپا کر دیا جائے۔فرقان بٹالین کے جوان اگرچہ آزمودہ کار نہ تھے لیکن اس کے باوجود انہوں

نے ہندوستانی چوکیوں پر پے در پے حملے کئے اور ان کے جاسوسوں کا صفایا کر کے بھارتی سپاہیوں کو اپنے مورچوں میں محصور ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

سیکٹر ہیڈ کوارٹر نے یہ خوشگوار تبدیلی دیکھتے ہوئے ہندوستانیوں کو ان کے محفوظ مقامات سے پیچھے دھکیلنے کے لیے ایک حملے کی تیاری شروع کر دی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں میں ہراس پیدا کر کے ان کے حوصلوں کو توڑ دیا جائے تاکہ ان کے لڑنے کا عزم ٹوٹ جائے اور جب وسیع حملہ شروع ہو اس وقت ہمارا کام زیادہ سہل ہو۔

فورس کے جوان نہ صرف وادی سعد آباد میں اپنی جنگی کارروائیاں آزادانہ کرتے تھے بلکہ وہ ہندوستانیوں کی حفاظتی چوکیوں کے عقب تک بھی چلے جایا کرتے تھے۔ انہوں نے بھارتی سپاہیوں سے متعلق ضروری معلومات حاصل کر لیں۔ اب پوری فوج حملہ کے لیے بالکل تیار تھی مگر افسوس یو این او کی مداخلت کے نتیجے میں جنگ بند کر دی گئی لہٰذا فرقان فورس نے بدلے ہوئے حالات میں اپنی ذمہ داریوں کا نئے سرے سے جائزہ لیا اور ہندوستانی خطہ دفاع کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر اپنی مضبوط چوکیوں کا سلسلہ قائم کرنا شروع کر دیا۔ بھارتی سپاہیوں پر اس کا شدید ردعمل ہوا۔ انہوں نے فورس کی چوکیوں پر توپوں اور ہوائی جہازوں سے زبردست بمباری شروع کر دی مگر ہندوستانی اپنی تعداد اور طاقت کی برتری کے باوجود اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس نہ لے سکے اور مجاہدوں نے وادی سعد آباد کو ہندوستانیوں پر بند کر دیا اور اس پانچ میل لمبی دو میل چوڑی وادی پر قبضہ کر کے پاکستانی علاقہ میں شامل کر لیا۔ یہ وادی اس علاقہ کی زرخیز ترین وادی ہے جس میں اب سینکڑوں مہاجر خاندان بس رہے ہیں۔

فرقان بٹالین کے لیے نقل و حمل کے وسائل دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ مسلسل ہوائی حملوں کی وجہ سے تمام رسد رات کے وقت پہنچائی جاتی تھی۔ اندھیری راتیں، بارش، کیچڑ، تنگ پگڈنڈیاں فوج کے لیے مشکلات کا باعث بن رہی تھیں اور اس وجہ سے اکثر اوقات جوانوں کو بروقت راشن نہ پہنچنے کی وجہ سے قلیل مقدار پر ہی گذارہ کرنا پڑتا تھا مگر اس ماحول میں بھی جوانوں کا حوصلہ ہمیشہ بلند رہا......

میدانِ جنگ میں حضرت سیدنا المصلح الموعود......بھی تشریف لے گئے۔ حضور کی تشریف آوری سے احمدی نوجوانوں میں نیا جوش، نئی امنگ اور نیا ولولہ پیدا ہو گیا......

فرقان بٹالین کے مجاہد عام طور پر چار اقسام پر مشتمل تھے:

اول: پاکستانی فوج کے اعلیٰ افسر جس میں کرنل سردار محمد حیات صاحب قیصرانی سب سے ممتاز ہیں۔ محاذ جنگ میں بٹالین کے سب سے پہلے کمانڈر آپ ہی تھے اور اس کے تنظیمی اور دفاعی کارناموں میں آپ کی مجاہدانہ کوششوں کا بھاری دخل ہے۔ آپ کے علاوہ میجر وقیع الزمان صاحب (سیکنڈ اِن کمانڈ)، میجر حمید احمد صاحب کلیم، میجر عبدالحمید صاحب، میجر عبداللہ مہار صاحب اور کیپٹن نعمت اللہ صاحب شریف نے مختلف کمپنیوں کی خوش اسلوبی سے کمان کی اور میجر وقیع الزمان صاحب فرقان کیمپ کے نوجوانوں کو ٹریننگ بھی دیتے رہے۔

دوم: مستقل عملہ جس میں معراجکے میں کام کرنے والے مجاہد بھی شامل تھے۔
سوم: بٹالین کا تیسرا طبقہ ان افسروں کا تھا جو رضا کار کی حیثیت سے جنگ کشمیر میں حصہ لے رہے تھے۔
چہارم: چوتھے نمبر پر (مگر تعداد کے لحاظ سے سب سے اول نمبر پر) ایثار پیشہ رضا کار تھے جن کی مجموعی تعداد آخر میں قریباً تین ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ان رضا کاروں میں خاندان حضرت مسیح موعود کے افراد، مربیان احمدیت، جامعہ احمدیہ، مدرسہ احمدیہ، تعلیم الاسلام ہائی سکول، تعلیم الاسلام کالج کے اساتذہ وطلبہ، ڈاکٹر، زمیندار، دکاندار، کلرک، غرضیکہ ہر حلقہ کے احمدی شامل تھے۔......

حکومت پاکستان نے فوری تصفیے اور اقوام متحدہ کے نمائندں کے کام میں مکمل تعاون کے پیش نظر بالآخر فیصلہ کیا کہ تمام رضا کار سپاہیوں کو آزاد کشمیر کے محاذ سے واپس بلا لیا جائے چنانچہ......۱۵ جون ۱۹۵۰ء کو فرقان بٹالین کی سبکدوشی کے احکام جاری کئے گئے اور ۱۷ جون ۱۹۵۰ء کو فرقان کیمپ متصل سرائے عالمگیر میں ایک خصوصی تقریب کے ذریعہ اس کی سبکدوشی عمل میں آئی۔ پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف (جنرل ڈگلس گریسی) چونکہ باہر دورہ پر تھے اس لیے انہوں نے ایک خاص پیغام بھجوایا جسے پاکستانی فوج کے بریگیڈیئر شیخ نے پریڈ کے معائنہ اور مارچ پاسٹ کے وقت سلامی لینے کے بعد پڑھ کر سنایا۔ اس موقعہ پر حکومت پاکستان اور آزاد کشمیر کے بعض اعلیٰ اور فوجی افسر بھی تشریف فرما تھے۔......

فرقان بٹالین کے جوان سبکدوشی کے بعد سرائے عالمگیر سے بذریعہ سپیشل ٹرین ۲۰ جون ۱۹۵۰ء کو ساڑھے نو بجے ربوہ پہنچے۔ سٹیشن پُر ان کا پُر جوش استقبال کیا گیا اور کرنل صاحبزادہ مبارک احمد صاحب اور دوسرے تمام مجاہدوں کو پھولوں کے ہار پہنائے اور ان پر پھول نچھاور کئے گئے۔

بٹالین کے تمام مجاہد پلیٹ فارم پر ترتیب وار اِیستادہ ہوئے۔ ان کے وردِ زبان وہی مسنون دعائیں تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد سے واپسی کے وقت پڑھا کرتے تھے چنانچہ سب مجاہد بہ آواز بلند دعا پڑھنے میں مصروف تھے آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ حَامِدُوْنَ لِرَبِّنَا سَاجِدُوْنَ۔ انہوں نے صحابہ کرام کی اتباع میں نہایت جوش کے ساتھ یہ شعر بھی پڑھا۔

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

یعنی ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہے کہ آخر دم تک جہاد کرتے رہیں گے۔

اسی روز شام کو چھ بجے مجاہدین کے اعزاز میں ایک خاص تقریب منعقد کی گئی جس میں......حضرت صاحبزادہ مرزا عزیز احمد صاحب (ناظر اعلیٰ) نے سلامی لی۔ مولوی عبدالرحیم صاحب درد نے کمانڈر انچیف پاکستان کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ ازاں بعد حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب فاتح الدین نے ایک مختصر لیکن پُرمعارف تقریر فرمائی جس میں فرقان بٹالین کی تاریخ، مجاہدین کے کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالنے کے علاوہ

خدائی تائید ونصرت کے ایمان افروز واقعات بھی بیان فرمائے جن سے نہ صرف بٹالین کے جوانوں نے بلکہ دوسرے لوگوں نے بھی یہ محسوس کیا کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے ان کی مدد اور حفاظت پر مامور ہیں چنانچہ مجاہدین بعض انتہائی شدید قسم کے خطرات میں سے محفوظ بچ نکلتے رہے اور بعض اوقات دشمن کے گولے اور بم نشانے پر لگنے کے باوجود کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔ حضرت صاحبزادہ صاحب نے اپنی تقریر کے آخر میں یہ اعلان فرمایا:

''ہم نے کشمیر میں اپنے شہید چھوڑے ہیں۔ جگہ جگہ ان کے خون کے دھبوں کے نشان چھوڑے ہیں۔ ہمارے لیے کشمیر کی سرزمین اب مقدس جگہ بن چکی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ جب تک ہم کشمیر کو پاکستان کا حصہ نہ بنالیں اپنی کوششوں میں کسی قسم کی کوتاہی نہ آنے دیں۔''

یہ باتیں تو خیر تاریخ کا حصہ ہیں۔ جہاں تک اجمل شاہد کی اپنی یادداشت کا تعلق ہے اس کے مطابق ۱۹۴۸ء میں گرمیوں کی تعطیلات سے کچھ روز پہلے جامعہ کے طلبہ کا ایک ہنگامی اجلاس بلایا گیا جسے مرکز سے آنے والے ایک تین رُکنی وفد نے خطاب کیا۔ انہوں نے طلبہ کو بتایا کہ جماعت کی طرف سے کشمیر کے محاذ پر فرقان فورس کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے جس میں جماعت کے رضا کار عسکری تربیت حاصل کرنے کے بعد ملکی دفاع کے لیے کام کریں گے لہٰذا طلبہ گرمیوں کی تعطیلات میں اپنے اپنے گھروں میں جانے کی بجائے اس فورس میں شمولیت کے لیے اپنے نام پیش کریں۔ یہ تحریک اس قدر مؤثر تھی کہ آدھے سے زیادہ طلبہ نے اسی وقت اس کے لیے اپنے نام پیش کر دیئے۔ محاذ سے واپس آ کر انہوں نے اپنے حیرت انگیز تاثرات بیان کئے چنانچہ جب دوبارہ اس کی تحریک کی گئی تو اجمل شاہد نے بھی اپنا نام پیش کر دیا اور اس طرح انہیں بھی اس جہاد میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی اور یہاں سے حاصل ہونے والے تجربات ان کی آئندہ زندگی میں بے حد مفید ثابت ہوئے۔

وہ بتاتے ہیں: سرائے عالمگیر کے مقام پر نہر اَپر جہلم کے کنارے ایک تربیتی کیمپ قائم کیا گیا تھا۔ محاذ پر جانے سے پہلے یہاں پر ایک مختصر ٹریننگ کے بعد رضا کاروں کو بذریعہ ٹرک بھمبر بھجوا دیا جاتا تھا جہاں سے تقریباً بیس میل کا سفر پیدل طے کر کے محاذ پر پہنچا جا سکتا تھا۔ موسمِ گرما میں پہاڑی علاقہ کے نشیب وفراز کا یہ سفر یوں بھی کافی مشکل تھا لیکن کمر پر لدا ہوا کم وبیش بیس سیر کا کٹُو اسے اور بھی مشکل بنا دیتا تھا۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ یہ سفر جو بھمبر سے تقریباً آٹھ بجے شروع ہوا تھا مسلسل بارہ گھنٹے جاری رہا۔ تقریباً نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمارا پہلا پڑاؤ ''سُکّا تلا'' نامی ایک مقام پر ہوا۔ یہاں پر حوائج ضروریہ سے فراغت، رُوکھا سُوکھا لنچ کھانے اور نمازِ ظہر وعصر کی ادائی کے بعد ہمارا اگلا سفر شروع ہوا۔ یہاں تک کا سفر خشک اور چھوٹی پہاڑیوں کا تھا۔ اس کے بعد کے علاقہ میں خُودرو اُونچے درختوں کے جنگلات تھے۔ ان جنگلات کے درمیان ہمیں اونچی نیچی پگڈنڈی پر ایک قطار کی صورت میں چلنا تھا۔ راستہ میں بعض جگہ پر برساتی نالے بھی آتے تھے۔ زیادہ بارش کی صورت میں ان میں بہت تیز پانی آ جاتا تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں محاذ پر رسد کے لیے زیادہ تر گدھوں کو استعمال کیا جاتا تھا لہٰذا ایسے مقامات سے گذرتے ہوئے اکثر گدھے گر جاتے اور رسد گیلی ہو جاتی جسے بعد میں اسی حالت میں استعمال

کرنا پڑتا۔

اجمل شاہد کو اب تک یاد ہے کہ جب وہ منزلِ مقصود یعنی محاذ پر پہنچے تو ڈیوٹی پر موجود مجاہدین نمازِ عشاء سے فارغ ہو چکے تھے۔ وہ سارے دن کے مشکل اور کٹھن سفر سے بے حد تھک چکے تھے چنانچہ کھانے اور نماز کی ادائی کے بعد وہیں ڈھیر ہو گئے۔ فجر کی نماز کے لیے بمشکل آنکھ کھل سکی۔

جب رضا کار محاذ پر پہنچتے تو انہیں کمپنیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اجمل شاہد کہتے ہیں کہ جب یہ تقسیم عمل میں آئی تو میرا قرعہ فال ''نصرت کمپنی'' کے نام پڑا۔ اس کمپنی کا ایک حوالدار ہم رضا کاروں کو اس کمپنی کے ہیڈ کوارٹر میں لے گیا جہاں کمپنی کے انچارج جمعدار نے ہمیں خوش آمدید کہا اور مختصر طور پر ہمارے فرائض سمجھائے، ہمیں بنکرز الاٹ کئے اور حوالدار سے کہا کہ ہماری چائے سے تواضع کی جائے۔ مجھے آج تک یہ بات نہیں بُھولی کہ وہ چائے بہت تیز تھی۔ ہم ایسی چائے کے عادی نہ تھے لہٰذا اسے پینے میں متردّد تھے۔ جمعدار نے ہمیں دیکھتے ہوئے دُور ہی سے کہا: یہ فوجی چائے ہے۔ اس کے پینے کے بغیر آپ لوگ فوجی فرائض سرانجام نہ دے سکیں گے چنانچہ ہم نے پہلی مرتبہ ایک فوجی حکم سمجھ کر یہ چائے بمشکل گلے سے اتاری لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہم اس کے اس قدر عادی ہو گئے کہ کوئی اور چائے ہمیں پسند ہی نہ آتی۔

جن ایام میں انہوں نے محاذ پر پہنچے سیز فائر ہو چکا تھا تاہم ان مجاہدین نے جو حالتِ جنگ میں یہاں پہنچے تھے انہیں بتایا کہ محاذ پر ہر وقت گولہ باری اور فضائی حملے ہوتے رہتے تھے اور جب بھی ایسی صورت حال ہوتی تو انہیں بنکرز میں پناہ لینی پڑتی تھی۔ بنکرز درحقیقت زمیں دوز پناہ گاہیں تھیں۔ بنکرز زمین کھود کر مناسب جگہ پر بنائے جاتے تھے۔ ان کی چھت موٹی لکڑی اور گھاس پھونس سے بنائی جاتی تھی۔ رات سونے کے لیے بنکرز ہی استعمال کئے جاتے تھے۔ شدید بارش میں پانی بسا اوقات بنکرز کے اندر آ جاتا لیکن دن کے تھکے ہارے مجاہدین ان موسمی اثرات سے بے نیاز دبکے پڑے رہتے اور بہرطور اپنی نیند پوری کرنے کی کوشش کرتے۔ اجمل شاہد کہتے ہیں: ہمارے وہاں پہنچنے تک حالات بدل چکے تھے لیکن غیر متوقع صورت حال کے مقابلہ کے لیے ہمیں ہر وقت تیار رہنا پڑتا تھا۔ جنگ ہو یا امن ایک فوجی کی زندگی بہت مصروف ہوتی ہے چنانچہ صبح سے لے کر رات تک ہمارے معمولاتِ زندگی بھی انتہائی مصروف تھے خاص طور پر فزیکل ٹریننگ کے لیے علی الصبح بروقت حاضر ہونا ضروری تھا۔ یہ تقریباً دو گھنٹے کی ایک تھکا دینے والی مشق تھی۔ انسٹرکٹر مختلف مشقیں باری باری کرواتا اور معمولی سی کوتاہی بھی برداشت نہ کرتا۔ ہمیں شروع میں یہ کام بہت مشکل محسوس ہوتا تھا لیکن آہستہ آہستہ ہم اس کے عادی ہو گئے۔

صبح وشام ایک تقریب رائفل میں بُلٹ بھرنے اور نکالنے کی ہوتی تھی تاکہ غلطی سے کوئی گولی چیمبر میں رُکی رہ کر کسی نقصان کا باعث بن سکے۔ شام کے وقت رائفل کو لوڈ کیا جاتا اور صبح اسے اَن لوڈ کرنا ہوتا تھا۔ اس امر کا جائزہ لینے کے لیے کہ گولی غلطی سے نالی کے اندر تو نہیں چلی گئی رائفل کا منہ اوپر اٹھا کر ٹرگر دبایا جاتا تھا۔ اس سے یقین ہو جاتا کہ نالی میں گولی موجود نہیں ہے لیکن نو آموز مجاہدین کئی دفعہ بھول جاتے یا تساہل سے کام

لیتے جس سے نقصان کا اندیشہ رہتا۔ اجمل شاہد بتاتے ہیں: ہم ایک دائرے کی صورت میں بیٹھ کر یہ عمل کرتے تھے۔ ایک دفعہ میرے سامنے بیٹھے مجاہد کی رائفل میں گولی موجود تھی اور رائفل کی نالی کا رخ اوپر ہونے کی بجائے ذرا ترچھا سا تھا۔ اس نے جونہی ٹرگر دبایا گولی میرے کان کے پاس سے شاں کر کے گذر گئی۔ اگرچہ میں ایک خوفناک حادثے سے بچ گیا تھا مگر مجھ پر اس کی دہشت کئی دن تک طاری رہی۔ جس مجاہد سے یہ غلطی ہوئی تھی اسے اس کی سزا دی گئی۔

اجمل شاہد مزید کہتے ہیں: ہمارے دیگر فرائض میں رات کا پہرہ بھی شامل تھا۔ رات کی تاریکی میں تنِ تنہا یہ ڈیوٹی بڑے دل گردے کا کام تھا۔ ہمیں رائفل کا رخ دشمن کی طرف رکھنا ہوتا تھا۔ اگر معائنہ ٹیم کسی مجاہد کا رائفل کے بارے میں تغافل پکڑ لیتی تو یہ ایک سنگین جرم تصور ہوتا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ دورانِ ڈیوٹی مجھے تھکاوٹ محسوس ہوئی تو میں نے ایک پتھر کا سہارا لے لیا۔ چاندنی رات تھی، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی چنانچہ میں رائفل کو مضبوطی سے پکڑ کر ایک پتھر پر نیم دراز ہو گیا۔ ان حالات میں نیند آ جانا کوئی غیر فطری امر نہ تھا۔ اسی اثنا میں معائنہ ٹیم وہاں آ گئی اور انہوں نے مجھ سے رائفل چھیننے کی کوشش کی۔ میں نے ہڑبڑا کر اونچی آواز میں ''ہالٹ!'' ''ہالٹ!'' کا شور مچایا جس سے وہ ڈر گئے کہ میں گھبراہٹ میں گولی ہی نہ چلا دوں۔ بعد میں مجھے اس کوتاہی کی سزا بھگتنا پڑی۔

جب محاذِ جنگ پر کھانے پینے کی سہولتوں کے بارے میں پوچھا جائے تو اجمل شاہد مسکراتے ہوئے جواب دیتے ہیں: سیز فائر کے بعد اگرچہ محاذ پر رسد اور سامانِ خورونوش کی فراہمی پہلے سے بہتر ہو چکی تھی تاہم اب بھی یہ ہماری ضرورت کے مطابق نہ تھی چنانچہ دیہات سے آنے والے رضا کاروں کو علی الخصوص کھانے کی کمی کی شکایت رہتی۔ ہفتہ میں ایک دن ہماری ڈیوٹی لنگر پر ہوتی تھی۔ روٹی پکوانے کے لیے سب کام خود کرنا پڑتا تھا البتہ سالن بڑے لنگر سے آتا تھا جسے ہم تقسیم کر لیتے تھے۔ روٹی پکانے کا تجربہ بڑا عجیب تھا۔ آٹا چونکہ گدھوں پر لد کر آتا تھا لہٰذا گیلا ہو جاتا۔ نتیجتاً اس میں سفید سنڈیاں پیدا ہو جاتیں۔ اسی آٹے سے روٹیاں پکائی جاتی تھیں۔ پکانے کے بعد روٹی اچھی طرح جھاڑی جاتی تاکہ سنڈیاں ممکنہ حد تک اتر جائیں۔ اضطراری حالات میں یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا۔ حالات میں بہتری کے باوجود ہر جوان کو صرف ایک روٹی ملتی تھی۔ جہاں تک چائے کا تعلق ہے آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جو گڑ رسد میں آتا تھا گیلا ہو کر بوری کے ساتھ چمٹ جاتا چنانچہ بوری دیگ میں ڈبو کر چائے بنا لی جاتی۔ ان حالات کا نقشہ جامعہ احمدیہ کے ہمارے ایک ساتھی عبدالسّلام ظافر نے اپنی ایک مزاحیہ نظم میں کھینچا تھا جس میں محاذِ کشمیر کے مختلف کرداروں کا بھی ذکر تھا لہٰذا اس نظم سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے سب سے پہلے ان کرداروں کا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ نظم کے پہلے بند میں ''عالم کباب'' کا کوڈ ورڈ استعمال ہوتا ہے اس سے مراد اُس وقت میجر اور بعد میں کرنل حیات قیصرانی ہیں۔ دوسرے بند میں صدر دین، کوارٹر ماسٹر کے لیے ''صدرُو'' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ تیسرے بند میں ''حنیف'' نامی ایک رضا کار کا ذکر ہے جو روٹی کی تقسیم پر مامور تھا اور ''ہیرو'' کے نام سے

معروف تھا۔آخری بند میں ''تارا'' کا لفظ ''تاراسنگھ'' کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو ہندوستانی فوجی کا علامتی نام ہے۔اب ملاحظہ فرمایئے اس نظم کا وہ حصہ جو میری یادداشت میں محفوظ ہے:

روٹی وٙلّوں ہویا جواب
ایتھے سِگٹ نہ پیٔو جناب
حکم سناوے ''عالمِ کباب''
ساڈے تے بھج گئے ھٙڈّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے
یارو مرگئے بُھکّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے

راشن ''صدرُو'' دے ڈھڈ چ پَیندا
دھرنا مار لنگر تے بَیندا
سارا لشکر ایہو ای کہندا
صدرُو نوں رب چُکّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے
یارو مرگئے بُھکّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے

آندر پڑھدی قُل شریف
روٹی لے کے نہ آیا ''حنیف''
سکھ تے کھاندے کھنڈ، رغیف
اسّی کھا کھا تُکّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے
یارو مرگئے بُھکّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے

ظافر ایتھے کوئی نہیں چارا
فضل کرُو ساڈا رب پیارا
راشن لے کے بیٹھا ''تارا''
سامنی پہاڑی اُتّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے
یارو مرگئے بُھکّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے

اس نظم کے حوالے سے یہاں شاید اس وضاحت کی ضرورت بھی ہو کہ اس کے تیسرے بند میں استعمال شدہ لفظ ''رغیف'' عربی زبان میں پراٹھے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔